بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

دنیا میں آج تک جتنی بھی مادّی تہذیبیں اُبھری ہیں ان کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں دوسری بہت سی خصوصیات کے علاوہ ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں انسان ایسے کارنامے انجام دینے کے پیچھے پڑا رہتا ہے جن میں سنسنی خیزی اور نمائش کا رنگ غالب ہو۔ اور اُن امور کی طرف بہت کم توجہ دیتا ہے جو اگرچہ اس کے لیے از حد ضروری ہیں مگر جن سے فضا میں ہلچل پیدا نہیں کی جا سکتی۔ یہ جوہری بم کے دھماکے، یہ برق رفتار طیارے اور اب چاند پر جانے کے منصوبے سب اسی مادّی تہذیب کے نمائشی پہلو ہیں۔

ہماری اس گزارش کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سائنسی ایجادات اور انکشافات یا علم و فن کی ترقی کسی اہمیت کی حامل نہیں بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ مادّی تہذیب کی آغوش میں پرورش پانے والا انسان ان اُمور کی طرف متوجہ نہیں ہوتا جن سے انسان کی روح کو سکون حاصل ہو اور اس کی انسانیت کو جلا ملے۔ بلکہ وہ اپنی ساری فکری اور عملی قوتیں ایسے کاموں میں کھپاتا ہے جن سے حالات کے اندر تلاطم پیدا ہو اور ہر شخص انہیں دیکھ کر ششدر رہ جائے۔

آپ اگر گذشتہ دو سو سال کے واقعات پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو اس امر کی پوری تصدیق ہو گی کہ انسان نے بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اس سے اس غرض کے تحت کام لینا شروع کیا تاکہ پیدائش دولت میں غیر معمولی اضافہ ہو۔ اضافہ تو بلاشبہ ہوا مگر انسان کو اس اضافے سے کیا حاصل ہوا؟ وسیع پیمانے پر بیروزگاری، مزدور کی آزادی کا خاتمہ، دولت کی غیر عادلانہ تقسیم، طبقاتی کشمکش، استعماریت کی ستمرانی، خاندانی نظام کی بربادی، اخلاقی اقدار کی پامالی اور جرائم کی زیادتی۔ اگر کثیر پیداواری اور زود پیداواری کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کو بحیثیت مجموعی فائدہ حاصل ہو تو کوئی صاحب بصیرت بھی موجودہ حالات کو دیکھ کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مادّی تہذیب اپنے اس

مقصد میں کامیاب ہوئی ہے۔

جدید انسان نے حمل و نقل اور پیغام رسانی کے ذرائع کو نہایت ہی بہتر بنایا۔ ظاہر بات ہے کہ اس کی یہ کوشش نیک غرض کے لیے ہی تھی۔ اس تگ و دو کے پیچھے اس کے سامنے یہ مقصد ہی کارفرما ہوگا کہ انسان اور انسان کے درمیان جو زمینی فاصلے حائل ہیں وہ کم ہوں اور سارے انسان ایک دوسرے کے قریب ہو کر سکون اور آرام سے زندگی بسر کریں۔ مگر عام واقعات میں اس سعی و جہد کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ انتہائی تشویشناک ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان اخوت کے رشتے قائم ہونے کے بجائے نفرت اور حقارت پیدا ہوئی اور انسانیت ایک وسیع برادری کی حیثیت سے زندہ رہنے کے بجائے مختلف دھڑے بندیوں کا شکار ہو کر رہ گئی۔ گروہی اور نسلی تعصبات نے انسانی اخوت کے پاکیزہ جذبات کو ختم کر کے رکھ دیا اور انسان جسمانی طور پر ایک دوسرے کے نہایت قریب ہونے کے باوجود ذہنی اور جذباتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے۔ نوع بشری کے افراد نے ایک دوسرے کی معاونت اور دستگیری کرنے کے بجائے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا اپنی زندگی کا اہم مقصد قرار دیا۔ دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں کے درمیان آج جو عداوت اور دشمنی پائی جاتی ہے اسے دیکھتے ہوئے کیا کوئی شخص ایک لمحہ کے لیے بھی باور کر سکتا ہے کہ دنیا کے سارے انسان ایک باپ کی اولاد ہیں۔ ان کی ایک دوسرے کے خلاف نفرت کو دیکھ کر تو یوں احساس ہوتا ہے کہ ان قوموں اور نسلوں کا خمیر ہی انسان دشمنی سے اٹھایا گیا ہے اور انہوں نے یہ طے کر رکھا ہے جب تک وہ ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے مٹا نہ لیں اس وقت تک انہیں چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ فاصلوں میں کمی اور تباہ کن آلات کی ایجاد نے انسان دشمنی کے اس جذبے کو انتہائی تشویشناک بنا دیا ہے۔ پہلے انسان کو اس منفی جذبہ کی تسکین کے لیے بڑی تگ و دو کرنا پڑتی تھی مگر اب یہ حال ہے کہ وہ اپنے دائیں بائیں جھانک کر جس قوم اور جس ملک کو چاہتا ہے چشم زدن میں برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ آخر زمین کے گوشے سمٹنے سے انسان کو کیا حاصل ہوا؟ کاش کہ موجودہ دور کا انسان اس پر سنجیدگی سے غور کرے۔

انسان نے پانی کی یلغار کو روک کر اس سے بجلی پیدا کی، فضاؤں میں اُڑ کر اپنی بالادستی کو تسلیم کروایا۔ انسان کے یہ کارنامے واقعی حیران کُن ہیں۔ پانی کی بپھری ہوئی قوت سرنگوں کی گئی اور دیوہیکل مشینری متحرک کرنے میں استعمال کی جانے لگی۔ آسائشات زندگی میں اضافہ ہوا۔ مگر ان مشینوں نے احساسِ مروت کو بالکل کچل کر رکھ دیا۔ کارخانہ داروں نے انسان کو انسان سمجھنے کے بجائے اسے مشین کا بالکل بے حس پرزہ سمجھ کر اس سے معاملہ کیا۔ اس کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا کہ وہ ہر قسم کے لطیف جذبات سے عاری ہے۔ وہ اپنے اندر کوئی ضمیر نہیں رکھتا، وہ عزتِ نفس کے احساس سے یکسر محروم ہے۔ وہ لوہے کی مشین کی طرح گوشت پوست کی محض ایک مشین ہے۔ جس پر کم سے کم خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ کام لینا چاہیئے کیونکہ یہ انسانی مشینیں تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ ہیں اس بنا پر انہیں معمولی رقم کے بدلے بڑی آسانی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اس نظریے کے مطابق انسان کی قدر و قیمت مشین کی طرح اس کی پیداواری قوت کی نسبت سے متعین کی جانے لگی۔ اگر پیداواری قوت زیادہ ہوئی تو منڈی میں اس کی قیمت زیادہ پڑی، لیکن اگر یہ قوت کم ہوئی تو اس کی قیمت میں اچھی خاصی کمی ہوگئی۔ کسی انسان نے یہ نہ سوچا کہ آخر اس ذی روح اور صاحبِ ارادہ ہستی کو مشین کی سطح پر رکھ کر اس کے ساتھ کیسے انصاف کیا جاسکتا ہے۔ اس معاملے پر کسی نے غور کرنا گوارا نہ کیا بلکہ انسان کے ساتھ مشین کی طرح کا سلوک کرنے پر اصرار کیا۔ کیونکہ اب کسی چیز کی افادیت کا معیار ہی سرمایہ کی فراہمی ٹھہرا اس لیے مشین اور انسان دونوں میں سے جو بھی پیدائشِ دولت کے اعتبار سے زیادہ مستعد ثابت ہوا اسے ہی زیادہ مفید خیال کیا گیا۔ تجربے اور مشاہدے نے اس امر کا فیصلہ کر دیا کہ مشین انسان کی نسبت زیادہ سرمایہ فراہم کرسکتی ہے چنانچہ بے جان مشینوں کے لیے تو ہر قسم کے تحفظات کا انتظام کیا گیا۔ مگر "اشرف المخلوقات" کو حوادث کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

اس اندوہناک صورتِ حال پر کچھ لوگوں نے آنسو بہائے۔ بعض ادیبوں نے افسانوں اور کہانیوں میں اس کا بڑے کرب و اضطراب کے ساتھ تذکرہ بھی کیا۔ مختلف ماہرینِ فن نے فنی مہارت کے ساتھ اس کا جائزہ لیا۔ مگر اس افسوسناک حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ سارے مفکرین اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان مشین سے جو گھٹیا

سمجھا گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو مشین ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ قدرت نے اسے ایک خودکار مشین بنایا تھا مگر اس کی حماقت دیکھیے کہ اس نے خواہ مخواہ اپنے دل و دماغ کے اندر بعض مذہبی معتقدات پال کر اور اخلاقی اور روحانی احساسات کو پرورش کر کے غیر مشینی روش اختیار کر لی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک بے حس مشین بننے میں ناکام رہا اور اس بنا پر لوہے کی مشین کے مقابلے میں اسے شکست کھانا پڑی۔ ان میں سے ایک مفکر نے اسے یہ بتایا کہ وہ غلطی سے اپنے آپ کو کسی ارفع و اعلیٰ ذات کا اس زمین پر خلیفہ سمجھ رہا ہے۔ درآنحالیکہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے محض ایک حیوان ہے اور حیوان ہی سے اس نے چند ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ شکل و صورت اختیار کی ہے۔ اس بنا پر اس کی حقیقی احتیاج مذہب و اخلاق نہیں بلکہ حیوانی ضروریات ہیں یعنی اسے پیٹ بھر کر کھانا اور صنفی جبلت کی تسکین کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل اور آزادی چاہیے۔ اخلاق اور روحانیت کی سب باتیں غیر فطری ہیں جو اس کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں بلکہ اس کے فطری طرز عمل میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔

مغرب کے انسان نے اس عجیب و غریب نظریے سے نہایت گہرا اثر قبول کیا اور جلد ہی یہ باور کر لیا کہ وہ واقعی حیوان ہے اور یہ مذہب، اخلاق اور روحانیت سب بیکار باتیں ہیں۔ انسان پر جس وقت اپنی حیوانیت کا راز کھلا تو پھر اس نے اپنے عمل کے محرکات کا از سر نو جائزہ لینا شروع کیا اور تحقیق کے ایسے نوادر پیش کیے کہ عقلِ سلیم سر پیٹ کر رہ گئی۔ اس نے انسان کو یہ باور کرایا کہ عمل کا اصل محرک ایک ہی ہے اور وہ بھوک ہے جو دو صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ پیٹ یا صنفی خواہش۔ ان مفکرین نے انسان کو اس بات کا یقین دلایا کہ انسانی افکار و اعمال کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کی تہ میں یہی ایک جبلت دو صورتوں میں نظر آئے گی۔ اس نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بڑے عجیب و غریب فلسفے گھڑے گئے اور بڑے عجیب و غریب نوعیت کے دلائل فراہم کیے گئے۔ دنیا کی نہایت اونچی مذہبی اور روحانی شخصیتیں، جن کی مقدس زندگیاں اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ انسانی عمل کا بنیادی محرک حیوانی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ کیونکہ اسے اخلاقی احساس کے ساتھ اس کرہ ارضی پر اتارا گیا ہے۔ بڑی بے دردی کے ساتھ زیر بحث لائی گئیں اور ان کے مقدس افعال و اعمال کو توڑ موڑ کر اس

طرح پیش کیا گیا جس سے ان کے باطل افکار کی تصدیق ہو سکے۔ ان مغربی مفکرین کو حقیقت اور سچائی کی تلاش نہ تھی بلکہ کسی طرح لوگوں کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ انسان نے حیوانیت کے مرتبہ سے بلند ہو کر نہ کبھی سوچا ہے اور نہ عمل کیا ہے اور انسان کے وہ افکار و اعمال جنہیں وہ اخلاقی اور روحانی کہتا ہے وہ درحقیقت حیوانی محرکات کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔

فکر و نظر کی یہ تبدیلی بڑی انقلاب انگیز تھی۔ اس نے اخلاق و شرافت کی ساری اقدار کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا اور انسان اس نہج پر سوچنے لگا کہ ضبطِ نفس کی وہ تعلیم جو اس نے مذہب سے حاصل کی تھی اور جسے وہ انسانیت کا جوہر سمجھتا تھا وہ تو درحقیقت اس کے نفس کے اندر اس کی شخصیت کے خلاف ایک خوفناک سازش ہے۔ چنانچہ اس نے مذہب، اس کے علمبرداروں اور اس کی تعلیمات کو بے وزن بنانے کے لیے بڑی شرمناک مہم شروع کی اور اپنے کام کا آغاز اس ارادے کے ساتھ کیا کہ انسان جب تک پوری طرح حیوان نہیں بن جاتا اس وقت تک وہ دم نہ لے گا۔

کسی معاشرے کے افراد کا مذہب پر ایمان رکھنے اور ضبط نفس کو انسانی زندگی کے لیے ضروری سمجھنے کے باوجود کسی وقت خواہشِ نفس سے مغلوب ہو کر کوئی بات کر لینا اور چیز ہے مگر مذہب کو انسان کا دشمن سمجھ کر اور ضبطِ نفس کو بیکار کی زنجیریں اور انسانی شخصیت کی ترقی کی راہ کا سنگِ گراں سمجھ کر، اس کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کرنا دوسری چیز ہے۔ حیوانیت کو زندگی کی اصل سمجھنے سے پہلے بھی انسان حیوانی سطح پر اُتر کر بعض حرکات کر لیتے تھے۔ مگر انہوں نے کبھی بھی اس سطح کو معیارِ مطلوب قرار نہیں دیا۔ انسان نے اسے ہمیشہ انسانیت کے ارفع و اعلیٰ مقام سے فروتر ہی خیال کیا مگر اس جدید انقلاب نے پوری زندگی کی بساط ہی اُلٹ کر رکھ دی اور انسان نے پورے شعور اور تدبّر کے ساتھ حیوانیت کو زندگی کا حقیقی جوہر قرار دے کر اپنے آپ کو حیوان بنانے کی کوشش کی۔

جس انسان کے اندر عقل اور شعور کی شمعیں روشن ہوں۔ جس کی فطرت کے اندر وجدان اور اخلاقی احساس موجود ہو، جس نے صدیوں تک تہذیب نفس کے لیے مسلسل جدوجہد کی ہو۔ اُسے اِن سارے فطری اوصاف سے محروم کر کے حیوانِ محض بنا دینا کوئی آسان کام نہیں۔ یورپ میں جب حیوانیت کی یہ تحریک شروع ہوئی تو اسے پہلے پہل تو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی، کیونکہ مسیحی پادریوں نے مذہب کے نام پر جو [illegible] اور انسانیت کش پابندیاں عائد کر رکھی تھیں ان کے خلاف عوام کو بغاوت کا نہایت اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ انہوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا، مگر بدقسمتی سے وہ اس معاملے میں توازن قائم نہ رکھ سکے اور انہوں نے ہر اُس چیز کی شدت سے مخالفت شروع کی جس کا کوئی تعلق بھی مذہب سے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاق، شرافت، پاکیزہ جذبات اور روحانی احساسات سب کو مذہب دشمنی کا یہ دھارا اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔

جو جذبہ اور احساس انسانی فطرت کے اندر پوری طرح جاگزیں ہو، بلکہ جو اس میں بنیادی عنصر کے طور پر شامل ہو، اسے بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنا کوئی کھیل نہیں۔ اس مشکل ترین کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انسانی فطرت کو مسخ کرنے کی ناپاک کوششیں کی گئیں۔ ان کوششوں کی یوں تو متعدد صورتیں اور بے شمار رُخ ہیں۔ مگر ان میں دو سب سے نمایاں ہیں۔ گوشت پوست کے انسان کے اندر جذبہ و احساس کا جو روحانی انسان بیٹھا ہوا ہے اس کے یا تو وجود کی نفی کی گئی یا اس کے بارے میں یہ تاثر قائم کیا گیا کہ وہ ایک لاش ہے جسے مذہبی گھٹن کی فضا نے متعفن کر دیا ہے۔ انسان اگر بہتر اور شادکام زندگی بسر کرنے کا متمنی ہے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خارجی زندگی میں کوئی خوش آئند تبدیلی پیدا کرے۔ اس تبدیلی سے ان حضرات کی مراد مادی حالات کے اندر تبدیلی ہے۔ یعنی انسان کو مادی دولت کی زیادہ سے زیادہ مقدار میسر آئے۔ انسان کی توجہ کو داخل سے ہٹا کر خارج میں لگانے کے لیے علم طبیعات کی اہمیت کو غیر معمولی حد تک بڑھایا گیا اور اسے یہ باور کرا لیا گیا کہ انسان کی اصل کامیابی یہی ہے کہ وہ عالم طبیعات میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا کرے اور اسے ہی کل کائنات خیال کرے۔

آفاق پر غور و فکر کو مذہب نے بھی اچھی خاصی اہمیت دی ہے اور اس کے شعور کو بیدار کرتے ہوئے انسان کو اس بات پر متوجہ کیا ہے کہ وہ آفاق میں پھیلی ہوئی آیاتِ الٰہی پر غور کر کے اللہ پر ایمان اور یقین کو مستحکم کرے کیونکہ جب تک اس کا خالقِ کائنات پر ایمان مستحکم نہیں ہوتا اس وقت تک وہ آفاق کی قدر و قیمت کو پوری طرح پہچان نہیں سکتا۔ مذہبی اندازِ فکر کے مطابق آفاق کی نشانیاں حقیقتِ کبریٰ کی عظمت کو پہچاننے کا محض ایک ذریعہ ہیں مگر مادی تہذیب کے پرستار نے خالقِ کائنات کے وجود پر ان محسوس شواہد کو ہی حقیقتِ کبریٰ سمجھ لیا اور اس امر کا یقین کر لیا کہ جو شے بھی حواس کی گرفت میں نہیں آسکتی یا جو مادی نقطہ نظر سے کسی اہمیت کی حامل نہیں ہو سکتی وہ محض ایک خیالِ خام ہے۔ اس طرح خدا، آخرت، حشر و نشر، جنت، دوزخ، وحی، ضمیر، وجدان، روح اور اخلاقی احساس سب کی سرے سے نفی کر دی گئی۔

ان لوگوں کو اپنی بالغ نظری کا بڑا ادعا تھا مگر عملاً ان کا حال یہ تھا کہ تعصب اور تنگ نظری کے شکار ہونے کی وجہ سے انسانیت کے یہ کرم فرما نفس کے ان بدیہی حقائق کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے رہے جو آفاق سے کہیں زیادہ ان کے قریب تھے وہ عالمِ طبیعیات کے طلسمات میں کھو کر رہ گئے مگر انہوں نے اس وسیع و عریض عالم کی طرف قطعاً توجہ نہ دی جس میں ان کی انسانیت کا جوہر موجود ہے۔ اور اگر انسانی روح کبھی اس طرف توجہ کرنے پر مجبور بھی ہوئی تو اُسے یہی کہہ کر ورغلایا گیا کہ جس عالم کو تم عالمِ روحانیت کہتے ہو وہ درحقیقت خارجی حالات کا بگڑا ہوا عکس ہے۔ اس لیے تمہیں باطن کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے خارجی حالات کی طرف پُوری توجہ دینا چاہیے۔ یہ ہے وہ غلط اندازِ فکر جس سے انسانی زندگی روحانی احساس سے آہستہ آہستہ عاری ہوتی گئی۔

انسان اس احساس سے دفعتہً محروم نہ ہُوا۔ اور نہ کبھی ہو سکتا ہے بلکہ روحانی اور اخلاقی احساس کو کمزور کر کے اسے حیوان بنانے میں اچھی خاصی مدت صرف ہوئی۔ اس ساری مدت میں انسان روحانی احساسات کی قدر و قیمت گھٹاتا رہا اور حیوانی جذبات کی اہمیت غیر معمولی حد تک بڑھاتا رہا۔ مگر کچھ وقت تک یہ دونوں

جذبات ایک دوسرے کے ساتھ موجود رہے لیکن جس انداز پر نئی تہذیب کو اٹھایا جا رہا تھا اس میں ناگزیر تھا کہ روحانی احساسات بالکل مضمحل ہو کر رہ جائیں اور ان کے مقابلے میں حیوانیت کی مکمل طور پر عملداری قائم ہو۔ مگر اس تبدیلی نے بعض عجیب و غریب پیچیدگیاں پیدا کیں۔ روحانی اور اخلاقی احساس کے کمزور پڑنے کی وجہ سے انسان کو اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ انسان کو خارجی زندگی کے جھمیلوں میں اس طرح الجھا دیا کہ اس کے اندر یہ احساس ابھرنے نہ پائے کہ اس کی صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ دورِ جدید کے معاشرتی اور معاشی نظام کا اگر سرسری سا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج جو فکر ان پر سب سے زیادہ مسلط نظر آتی ہے وہ فکر معاش ہے۔ جس انسان کو بھی دیکھیے اس کے لیے معاش کا مسئلہ دردِ سر بنا ہوا ہے۔ اس مسئلے میں انسان کو جان بوجھ کر اس لیے الجھایا گیا ہے تاکہ فکر معاد اسے کسی طرح اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔

جدید انسان معاشی الجھنوں ہی میں گرفتار نہیں بلکہ سیاسی اور معاشرتی پیچیدگیاں بھی ہر وقت اس کے لیے دردِ سر بنی رہتی ہیں اور وہ بیچارا انہیں حل کرنے ہی میں عمر عزیز صرف کر دیتا ہے مگر اسے معمولی کامیابی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ آپ مثال کے طور پر انصاف کو ہی لیں۔ کسی معاشرے میں انصاف کا حصول چونکہ ہر فرد کی بنیادی ضرورت ہے اس لیے اسے ہوا اور پانی کی طرح ارزاں اور اس کا طریق کار سورج سے زیادہ واضح اور روشن ہونا چاہیئے تاکہ یہ ہر فرد کو بآسانی میسر آسکے۔ مگر اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کی اس بنیادی ضرورت کے حصول کے لیے انسان کو بہت زیادہ روپیہ اور محنت صرف کرنی پڑتی ہے اور بڑے صبر آزما مراحل سے گذرنے کے بعد میزان عدل تک اس کی رسائی ہوتی ہے پھر اس میزان کا نظام اتنا پرپیچ ہوتا ہے کہ ایک عام انسان اس کے ابتدائی طریق کار کو بھی سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور وہ جب تک کسی ماہر فن کی خدمات حاصل نہ کر لے اس وقت تک وہ عدالت کی بارگاہ میں حاضری کی جرأت نہیں کر سکتا۔

یہی پیچیدگیاں انتظامیہ میں بھی ہر مرحلے پر پیش آتی ہیں۔ انتظامیہ کی اصل غرض تو اسی قدر ہے کہ وہ کسی معاشرے کے اندر رہنے والے افراد کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے تاکہ لوگ

اطمینان اور سکون سے زندگی بسر کر سکیں مگر مادی نظام نے اس کے طریق کار کو اتنا پیچیدہ بنا دیا ہے کہ کسی فرد کو اپنے اس انسانی بنیادی حق کے حاصل کرنے کے لیے اتنی کڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے کہ اُسے زندگی کے دوسرے مسائل یکسر بھول جاتے ہیں۔

اندر کے انسان سے یہ اغماض اور صرف نظر اور خارجی زندگی اور اس کے معاملات سے یہ غیر معمولی وابستگی بلکہ انہماک اس انداز فکر کا بالکل قدرتی نتیجہ ہے جسے مادی تہذیب نے جنم دیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ انسان جب عالم باطن سے اپنی توجہ ہٹا لیتا ہے تو اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو کسی راہ پر لگانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُسے خارجی دنیا کے جھمیلوں میں پھنسا دیا جائے تاکہ وہ مصروف رہے۔

سیاسی معاشرتی اور معاشرتی زندگی کے خارزار کے علاوہ ایک اور میدان جس میں الجھا کر انسان کو روحانی اور مذہبی احساسات کی عظیم دولت سے بیگانہ رکھا جاتا ہے وہ سائنسی اور فنی تحقیقات ہیں۔ ہمیں ان تحقیقات کی اہمیت سے انکار نہیں۔ ان سے علم کے افق وسیع تر ہوئے ہیں۔ مگر چونکہ یہ تحقیقات اخلاقی اور روحانی احساس سے یکسر بے تعلق ہوتی ہیں۔ اس لیے ان سے جو قوت بھی ہاتھ آتی ہے اس کا بیشتر حصہ بیکار کاموں بلکہ تباہ کن کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ آپ جوہری توانائی کو ہی دیکھیے اس کی دریافت سے انسان کے ہاتھ میں کس قدر غیر معمولی قوت آئی ہے۔ مگر آج اسے انسان اپنے بھائیوں کی وسیع پیمانے پر ہلاکت اور بربادی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ دنیا کی مختلف قومیں کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپے اسے بنانے پر صرف کر رہی ہیں مگر اس سے ان کی سب سے اہم غرض یہی ہے کہ اس کی مدد سے دوسری اقوام کو غلام بنایا جائے۔ ان کے وسائل پر قبضہ کیا جائے اور اگر کوئی قوم اس راہ میں مزاحم ہو تو اسے چشم زدن میں ملیامیٹ کر دیا جائے۔

انسان کو زندگی کے خارجی طلسمات میں مستقل طور پر گرفتار رکھنے کے لیے اہل یورپ اس بات کا برابر التزام کرتے رہتے ہیں کہ عوام کے سامنے بغیر کسی وقفہ کے عالم طبعیات کے نہایت سنسنی خیز پہلو آتے

رہیں تاکہ ان کی توجہ کسی دوسری طرف مبذول نہ ہونے پائے۔ ان دنوں چاند پر انسان کو اتارنے کی تیاریاں اور ان کے چرچے سب اسی ذہنیت کے مظاہر ہیں۔ آج انسان جس دنیا میں آباد ہے وہ اس کے لیے دوزخ بنی ہوئی ہے۔ بے شمار لاینحل مسائل ایسے ہیں جو حل کے لیے اس کی توجہ اور ناخن تدبیر کے محتاج ہیں۔ مگر چونکہ ان کی طرف متوجہ ہونے اور انہیں کسی حد تک حل کر لینے سے سنسنی خیزی پیدا نہیں ہو سکتی اس لیے انہیں جوں کا توں چھوڑ کر چاند پر پہنچنے کے لیے سر توڑ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یہاں ان سب مسائل کا تذکرہ طوالت کا باعث ہوگا۔ ہم صرف چند اہم مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔

اگر روحانی مسائل کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس وقت دنیا کا سب سے اہم مسئلہ اخلاقی بگاڑ ہے۔ دنیائے مشرق کو تو جانے دیجئے کہ یہ کرہ ارضی کا غیر مہذب حصہ ہے خود مغربی تہذیب کے گہوارے میں جرائم کی رفتار اس قدر زیادہ ہے کہ لوگ چیخ اٹھے ہیں۔ قتل و غارت ڈاکہ، اغوا، زنا، چوری اور لوٹ کھسوٹ فریب دہی یہ وہ عام جرائم ہیں جن میں بڑی تشویشناک رفتار کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ چند ماہ ہوئے ریڈرز ڈائجسٹ میں امریکہ کے سابق صدر آیزن ہاور کا اس موضوع پر ایک فکر انگیز مضمون شائع ہوا تھا جس میں اس نے ان جرائم کی ہر آن بڑھتی ہوئی رفتار پر بڑے کرب و اضطراب سے اظہار خیال کیا اور اس امر کا اعتراف کیا کہ اخلاقی بندھن نہ ہونے کی وجہ سے انسان بالکل بے لگام ہوتا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں اس نے قانون اور انتظامیہ کی بے بسی کا بھی بڑے دردناک الفاظ میں تذکرہ کیا۔

یہ اندوہناک صورت حال صرف امریکہ ہی میں نہیں، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور دوسرے مہذب ممالک بھی اس معصیت کا شکار ہیں۔ خصوصاً نوجوان نسلیں تو اس قدر بے قابو ہوتی جا رہی ہیں کہ مغرب کے بعض مفکرین بے اختیار ہو کر یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ کیا انسان تباہی سے بچ بھی سکے گا یا نہیں۔ جن ممالک میں ایک منٹ میں قتل کی ایک واردات ہو۔ ایک منٹ میں ڈاکہ پڑے اور ایک منٹ میں اغوا جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا جائے وہاں لوگوں کے اندر جان و مال کے تحفظ کے بارے میں کیا احساس ہوتا ہوگا۔

یہ مسئلہ زندگی کا کوئی ثانوی مسئلہ نہیں جسے وقتی طور پر پس پشت ڈالا جا سکے۔ جب کسی معاشرے میں

انسان کی جان اور اس کی عزت و آبرو ہی محفوظ نہ ہو تو وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے دل و دماغ پر ہر وقت خوف و ہراس طاری رہتا ہے جو اس کے اندر لاتعداد ذہنی عوارض پیدا کرتا ہے۔ دورِ جدید میں انسان کی معاشرتی زندگی کے اندر جو اختلال پیدا ہوا ہے اور خود اس کے اعصاب پر جو غیر معمولی بوجھ پڑا ہے اس کی ایک بڑی وجہ عدم تحفظ کا یہی احساس ہے۔

ان جرائم کے علاوہ لاتعداد مسائل ابھی ایسے ہیں جو انسانی توجہ کے محتاج ہیں۔ بھوک، بیماری، دولت کی غیر عادلانہ تقسیم، اشتعاریت الغرض اس نوعیت کی لاکھوں محرومیاں اور ستم رانیاں انسان کا مقدر بن چکی ہیں۔ معاشی منصوبہ بندیوں کے اس دور میں دنیا میں کروڑوں نہیں اربوں انسان ایسے ہیں جنہیں زندگی کی بنیادی ضروریات تک میسر نہیں۔ خصوصاً مشرقی ممالک میں تو غربت اور افلاس نے لوگوں کے لیے جسم اور روح کے رشتے کو برقرار رکھنا قریب قریب ناممکن بنا دیا ہے۔

طبی ترقی کے اس دور میں کروڑوں افراد طبی سہولتوں سے یکسر محروم ہیں اور معمولی بیماریوں کا تو ذکر ہی کیا وہ شدید علالت کے وقت بھی اپنے لیے کسی معمولی علاج معالجہ کا انتظام نہیں کر سکتے۔ دنیا کی کسی قوم کے اندر بھی عدل و انصاف کی حس باقی نہیں رہی۔ ہر طاقتور قوم جب موقع پاتی ہے تو کمزور اقوام کو ہڑپ کرنے کی کوششیں شروع کر دیتی ہے اور اس معاملے میں کسی ضابطہ اخلاق کی پرواہ نہیں کرتی۔

زندگی کے یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے لاتعداد مسائل انسانیت پر ہر لمحہ اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ ان مسائل نے اس دنیا میں انسان کا جینا دوبھر بنا دیا ہے اور انہیں ہم سے ہر شخص پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے مگر ان کی طرف اتنی توجہ نہیں دیتا جس کے کہ یہ فی الحقیقت مستحق ہیں۔

پھر ان مسائل کی کوئی نوعیت بھی ایسی نہیں کہ جن کا حل انسان کی دسترس سے باہر ہو۔ مشینوں کی ایجاد نے اشیاء کی پیداوار کو اس حد تک بڑھا دیا ہے کہ اگر خالص انسانی نقطہ نظر سے منصوبہ بندی کر کے اس امر کی کوشش کی جائے کہ دنیا کا کوئی فرد بھی زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے تو یہ ناممکن

نہیں۔ دنیا میں آج جو اربوں نہیں بلکہ کھربوں روپے انسان کو ہلاک کرنے میں صرف کیے جا رہے ہیں۔ انہیں اگر انسان کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جائے تو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ایک اچھی خوشحال زندگی کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح آج دنیا کی ہر قوم کے پاس اس قدر وسائل موجود ہیں یا وہ ایسے وسائل کا انتظام کر سکتی ہے کہ دوسری اقوام کے وسائل سے یکسر بے نیاز ہو کر آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ وہ اگر دوسرے ممالک پر قبضہ کرتی ہے تو کسی حقیقی ضرورت کے تحت نہیں کرتی بلکہ محض اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے لیے انہیں اپنے ظلم وستم کا نشانہ بناتی ہے۔

انسان پر انسان کی چیرہ دستیوں کو روک کر انسان کے لیے بہتر اور شادکام زندگی کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس کو ختم کیا جائے۔ اس وقت دنیا میں جو ہمہ گیر فساد برپا ہے اس کی وجہ انسان کی حرص ہی ہے اور یہ کوئی ایسی وجہ نہیں جو انسانی ادراک سے ماوراء ہو۔ معمولی فہم و شعور رکھنے والا انسان بھی اس حقیقت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ انسان کی خود غرضی نے اس پوری دنیا کو ظلمت کدہ بنا دیا ہے۔ اگر اس میں اعتدال پیدا کیا جائے تو انسانیت کے بہت سے مسائل حل کیے جا سکتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ آخر انسان چاند کی طرف تو بڑے جذبۂ شوق سے لپکتا ہے مگر اپنے دل کے اندر جھانک کر فساد کے ان مراکز کو دیکھنے کی کیوں کوشش نہیں کرتا، جنھوں نے اس کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔

یہ تو خیر داخلی زندگی کا مسئلہ ہے خود انسان کی خارجی زندگی میں بے شمار مسائل ایسے ہیں جو سائنس دانوں کی توجہ کے محتاج ہیں۔ دنیا میں ابھی کرہ ارض کا اچھا خاصہ حصہ ایسا ہے جو بے آب و گیاہ ہونے کی وجہ سے بیکار پڑا ہے۔ متعدد ایسی بیماریاں ہیں جن کا ابھی تک علاج دریافت نہیں ہوا اور انسانوں کی اچھی خاصی تعداد ان کا لقمہ اجل بن رہی ہے مگر ان کے تدارک کے لیے اس جوش اور انہماک اور اس ایثار کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا جو جوہری بم بنانے اور چاند پر پہنچنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اگر ان سائنسی تحقیقات کا مقصد فلاح انسانیت ہوتا

تو کوئی وجہ نہ تھی کہ انسان سب سے زیادہ توجہ ان امور کی طرف دیتا جن سے انسانیت کو حقیقی بہبود حاصل ہوتی۔ اس ضمن میں انسان سب سے پہلے اصلاح باطن کی طرف متوجہ ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں یہ فرمایا ہے کہ "تمہارے پہلو میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہے تو تمہارا پورا جسم صحیح ہے اور اگر اس میں فساد ہے تو پھر سارا جسم فساد کی لپیٹ میں ہے"۔ جب تک اخلاق اور روحانی احساس کے اس سرچشمے کو حرص و آز، خودغرضی اور زبردست آزاری سے پاک نہیں کیا جاتا اس وقت تک سائنسی تحقیقات سے صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اگر انسان واقعی انسانیت سے محبت و ہمدردی رکھتا ہے اور وہ سچے دل سے اس کی فلاح کا طالب ہے تو اسے سب سے زیادہ توجہ تہذیب نفس کے اس بنیادی کام پر دینی چاہیئے مگر افسوس کہ اس کام سے وہ سب سے زیادہ غفلت برت رہا ہے۔ انسان کی بدنصیبی دیکھیے کہ وہ عالم طبیعات میں اپنی ہنرمندی اور جرأت دکھانے کے لیے تو ہر قسم کے ایثار کے لیے آمادہ ہوتا ہے مگر اپنے نفس پر کوئی معمولی سی پابندی عائد کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔ کیونکہ یہ کام اگرچہ زندگی میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے مگر چاند پر اترنے سے جو سنسنی خیزی پیدا ہوسکتی ہے وہ تہذیب نفس سے پیدا نہیں ہوسکتی۔ اسی وجہ سے یہ کام اس کی توجہ کا مستحق نہیں بن سکتا۔

اس وقت انسانیت کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ کس طرح انسان کو اس بات کے لیے آمادہ کیا جائے کہ وہ عالم طبیعات سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے باطن کی طرف متوجہ ہو۔ یہ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کے بارے میں جو غلط نظریات پھیلے ہوئے ہیں ان کا ابطال کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ وہ نہ تو حیوان ہے اور نہ معاشرے کی مشین کا بےبس پرزہ بلکہ ایک صاحب ارادہ اور اخلاقی اور روحانی احساس رکھنے والی ایک قابلِ احترام ہستی ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ حیوانوں اور مشینوں کا سا سلوک کرنا سخت ناانصافی ہے۔۔۔ جب تک نوعِ بشری اس کے جذبات و احساسات کو نظر انداز کرکے اُس کے ساتھ یہ ظالمانہ طرز عمل اختیار کرنے پر مصر رہے گی اس وقت تک انسان کے حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں

ہو سکتی۔

جو لوگ انسان نما حیوان یا انسان نما مشین کو جوہر انسانیت سے از سر نو آراستہ کرنے کے متمنی ہیں ان پر سب سے پہلا فرض یہ عاید ہوتا ہے کہ وہ ان نظامہائے حیات کے خلاف صف آرا ہوں جنہوں نے اسے اعلیٰ اور ارفع مقام سے گرا کر ایک مشین یا حیوان کی سطح پر لا ڈالا ہے۔ ڈارون اور اس کے ہم خیال سائنس دانوں نے انسان کا رشتہ حیوان کے ساتھ جوڑا اور اسے جنت کی مخلوق کے زمرہ سے نکالا کر بندر اور مانس کے ساتھ لا کھڑا کیا اور وطنیت اور قومیت کے نام پر اس سے حیوانوں کی طرح بے دریغ کام لیا جانے لگا۔

اسی مشینی دور میں انسان کو یہ گوارا نہ تھا کہ انسان حیوان کی سطح پر بھی رہے وہ اسے تمام احساسات و جذبات سے محروم کر کے بے حس مشین بنا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے ذہن میں یہ باطل خیال جاگزیں کیا گیا کہ ہر دَور کے معاشی حالات خصوصاً پیدائش دولت کے ذرائع نہ صرف اِس دَور کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ ان کی پوری طرح صورت گری بھی کرتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں ہر دَور کی سیاست، معیشت اور معاشرت پیدائش دولت کے طریقوں کی مظہر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی معاشی قوّتوں کی کرشمہ سازی ہے اور وہ جس سانچے میں چاہیں اسے بڑی آسانی کے ساتھ ڈھال سکتی ہیں۔

یہ تو اجتماعی زندگی کا وہ مادی تصور ہے جسے مارکس نے پیش کیا ہے انسان کی انفرادی زندگی یعنی اس کے ذاتی احساسات و جذبات، اس کے عقائد و تصورات اور اس کے اخلاقی معیارات بھی مارکس کے نزدیک اِس دَور کے معاشی حالات کا پرتو ہی ہوتے ہیں جس میں کوئی انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی افکار و نظریات یا معتقدات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو کسی مستقل قدر و قیمت کی حامل ہو۔ اور انسان کے اندر کوئی ایسا جذبہ یا احساس موجود نہیں جسے انسانیت کا پائیدار مستقل اور حقیقی جوہر کہا جا سکے۔ ہر دور کا اپنا الگ ایمان اور الگ جوہرِ انسانیت ہے جس کا انسان کے روحانی احساسات سے قطعاً

کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے وجود کے لیے سرتاپا پیدائش دولت کے طریقوں کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ انسان کے بارے میں اس طرزِ فکر نے نہ صرف انسان کا انسانیت کی وسیع برادری سے رشتہ منقطع کر دیا ہے بلکہ اسے انسانیت کی مشترک میراث سے محروم کر کے اسے عملاً اپنے دور کے معاشرے کی ایک بے حس مشین بنا کر رکھ دیا ہے۔

جماعت اسلامی حلقہ مشرقی کراچی

کا

دلکش۔ جاذبِ نظر۔ رنگین

ہجری — عیسوی

کیلنڈر

ربیع الاول ۱۳۸۹ھ تا صفر المظفر ۱۳۹۰ھ

مطابق مئی ۱۹۶۹ء تا اپریل ۱۹۷۰ء

دو رنگ میں۔ آفسٹ طباعت، اعلیٰ اور معیاری کتابت

ہر صفحہ دو مختلف رنگ میں —— چھ اوراق پر مشتمل

آیاتِ قرآنی —— جماعتِ اسلامی کی دعوت

—— جماعتِ اسلامی کی تعلیمی پالیسی، معاشی اصلاحات

—— داخلہ پالیسی، خارجہ پالیسی اور صنعتی پالیسی

پر مشتمل ——

- تحریکِ اسلامی کا پیغام
- جماعتِ اسلامی کا تعارف، مختصر اور جامع
- کارکن کیلئے دعوت پہنچانے کا بہترین ذریعہ
- ہر گھر کی ضرورت

قیمت فی کاپی
ایک روپیہ ۲۵ پیسہ

پتہ: سید کاظم علی
مکتبہ چراغِ راہ، کراچی

اپنے آرڈر سے جلد مطلع کیجیے